زبان اور ثقافت

ڈاکٹر مشتاق صدف

تلخیص: زبان اور ثقافت کا رشتہ لازم وملزوم ہے۔دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔زبان ثقافت کی تشکیل میں معاون ہوتی ہے جب کہ ثقافت زبان کو تشکیل دینے میں اہم اور کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ثقافت نہ صرف کسی زبان کی تشکیل وتعمیر میں مددگار ثابت ہوتی ہے بلکہ کسی مخصوص ثقافت سے زبان میں ایک طرح کا انفراد قائم ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک علاقے یا خطے کی زبان دوسرے علاقے یا خطے سے بالکل الگ اور مختلف ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں کی جڑیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔بعض اوقات کسی زبان کے ثقافتی پہلو اس قدر کسی زبان میں داخل ہو جاتے ہیں کہ وہ زبان کسی مخصوص علاقے یا خطے کی ثقافتی شناخت کی پہچان بن جاتی ہے۔

کلیدی الفاظ: زبان، ثقافت، ثقافتی رشتہ، تہذیبی شناخت، مشترکہ ہندوستانی تہذیب، تخلیقی عمل

زبان اور ثقافت کا باہمی رشتہ صدیوں سے گہرا رہا ہے۔جسم وجاں کی طرح زبان و ثقافت کا رشتہ بھی اٹوٹ ہے۔انسان کی زندگی زبان اور ثقافت سے ہمیشہ وابستہ رہی ہے۔ اگر انسان بے زبان ہو تو اس کی شناخت مشکل ہے اور اگر اس کی اپنی کوئی ثقافت نہیں تو اس کا کوئی سماج بھی نہیں ہوگا۔دراصل زبان زبان ہونے کے ساتھ ایک ثقافت بھی ہے اور اسی طرح ثقافت ثقافت ہوتے ہوئے بھی وہ ایک طرح سیز بان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔یعنی ثقافت جب پروان چڑھتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ زبان کا ارتقائی سفر بھی دیکھا جا سکتا

ہے۔ہم زبان کا استعمال ثقافتی نظم ونظر اور عقیدے کی فہم وادراک کے لیے کرتے ہیں۔ہم زبان اور ثقافت کی مدد سے ہی تاریخ کی جستجو کو یقینی بناتے ہیں۔زبان اور ثقافت دونوں کی ایک مشترکہ خوبی یہ ہے کہ یہ دونوں ہمیں تاریخ کے منظر، پس منظر اور پیش منظر میں لے جاتی ہیں۔ہم زبان اور ثقافت کی مدد سے ہی تاریخ کے صفحات کو کھنگال سکتے ہیں۔تاریخ کے گزشتہ روز وشب کو ہم زبان اور ثقافت کی مدد سے ہی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔یہ بھی سچ ہے کہ زبان اور ثقافت سے ہی ہمارے افکار وخیالات کی بہتر تشکیل ہوتی ہے۔زبان کی مدد سے ہم ہمیشہ دوسروں کی ثقافتی اقدار کے ساتھ ہم ان کی فکر ونظر کو بھی متابر کرتے رہے ہیں۔زبان ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ رہی ہے۔زبان انسان کی روزمرہ زندگی کو پوری طرح اپنی گرفت میں بھی لے لیتی ہے۔

زبان اور ثقافت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔جیسے رات کے لیے دن، زمین کے لیے آسمان وغیرہ کو سمجھنا ضروری ہے اسی طرح ان دونوں کے باہمی رشتے کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔اوراس کے لیے ایک خاص فہم کی ضرورت ہے۔جس طرح اجالے کو سمجھنے کے لیے اندھیرے کا علم حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح زبان کی فہم کے لیے ثقافت کا علم ضروری ہے۔زبان کے بنا ہم ثقافت کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔ثقافت کی فہم رکھنا تو دور کی بات ہے۔کسی بھی زبان کا اپنا ایک الگ دائرہ، علاقہ، خطہ، گروہ اور ملک ہوتا ہے۔جب ہم کسی زبان کے جاننے والے افراد سے گفتگو کرتے ہیں تو اس وقت ان کی ثقافت کے ساتھ بھی میل ملاپ کرتے ہیں۔گویا زبان کے ساتھ ثقافت کی امد فطری بات ہے۔جب ہم کوئی زبان سیکھتے ہین تو صرف اس زبان کے حروف تہجی، قواعد، الفاظ کے دروبست ہی نہیں سیکھتے بلکہ اس زبان کے بولنے والوں کی ثقافت اوران کے روزمرہ زندگی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتے ہیں۔یعنی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس زبان سے تعلق رکھنے والے فراد، قوم یا ملک کی ثقافت کو بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ اس لیے ضروری ہے کہ زبان اور ثقافت کا باہمی رشتہ بہت اٹوٹ ہے۔دراصل زبان کی جڑیں ہر سطح پر ثقافت سے پیوست ہوتی ہیں۔زبان کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔زبان بولی بھی جاتی ہے لکھی بھی جاتی ہے اور تقریر کی شکل بھی اختیار کرتی ہے۔زبان سے ہم خود بھی

پہچانے جاتے ہیں اور دوسروں کی شناخت بھی کرتے ہیں۔ پھر بھی آج تک یہ بات حتمی طور پر معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ گفتگو کے آغاز کا پہلا دن کون سا ہے۔ انسانی زبان کب کہاں، کیسے اور کیوں شروع ہوئی۔ اس کی جڑیں کہاں تک گہری ہیں۔ اس تعلق سے ماہرین لسانیات کی مختلف آراء ہیں۔ ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ زبان پہلی بار کب ادا کی گئی اور کس طرح کی گئی اس کی کوئی دستاویز موجود نہیں ہے۔

دوسری طرف اگر ثقافت کی بات کی گئی تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کسی بھی زبان سے وابستہ افراد طرز زندگی، طرز عمل، بودوباش اور ان کی خوبیاں ثقافت کو واضح کرتی ہیں۔ دراصل ثقافت کا دائرہ خصوصی طور پر زبان، فنون لطیفہ، رسم رواج، تہذیب وتمدن، بودوباش، ہنر وغیرہ سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ ثقافت کے بنیادے زمرے کہے جاتے ہیں۔ سماج میں ثقافت کا ایک کلیدی کردار رہا ہے۔ ثقافت سے ہم بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ ثقافت ہماری فکر ونظر کو وسعت دیتی ہیاور بتاتی ہے کہ ہمیں دوسروں کے ساتھ کس طرح بات کرنی چاہیے۔ ہماری سوچ کیسی ہونی چاہیے اور ہمیں قرب وجوار کے ماحول کو کیسے سمجھنا چاہیے۔ درحقیقت اس سے ایک واضح ثقافتی نظریہ قائم ہوتا ہے۔ ثقافت اور زبان کی باہمی طاقت سے نزدیکیاں بڑھتی ہیں اور فاصلے کم ہوتے ہیں۔ ہر زبان کی ایک الگ تہذیبی و ثقافتی رشتے رہے ہیں۔

زبان کی سطح پر ہم افراد کو الگ الگ علاقوں، شہروں اور ملکوں سے شناخت کرتے ہیں اسی طرح ثقافت سے بھی الگ الگ گروپس اور خطوں کی پہچان کر سکتے ہیں۔ جیسے ہم اکثر مغربی ثقافت اور مشرقی ثقافت کی نشاندہی کر کے دو بڑے خطوں کی پہچان کرتے ہیں۔ گویا ہر شخص، ہر علاقہ، ہر خطہ، ہر ملک وغیرہ کی اگر زبان الگ ہوتی ہے تو ان کی ثقافت بھی الگ ہوتی ہے۔

ثقافت اور زبان کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے جس کی فہم کے لیے چشم کشا نظر کی ضرورت پڑتی ہے قومی لوک گیت ہو، داستان ہو یا پھر باہمی گفتگو، زبان اور ثقافت ہمیشہ ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں۔

دراصل زبان کی طرح کلچر بھی کسی معاشرے میں ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے جو

افراد کو آپس میں جوڑے رکھتی ہے۔ آپس میں قربت پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا بندھن بھی ہے جو ایک دوسرے سے کبھی کسی کو الگ نہیں ہونے دیتا۔ کبھی کسی کو بکھرنے اور ٹوٹنے نہیں دیتا بلکہ یہ بندھن ہمیشہ آپسی رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ یہ بندھن ایک شخص کو دوسرے سے، ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ، ایک نسلی گروہ کو دوسرے نسلی گروہ سے، ایک سماج کو دوسرے سماج سے جوڑے رکھتا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اگر بات کی جائے تو یہاں کی معاشرت، تہذیب وثقافت، رسوم ورواج، عقائد، زبان وادب وغیرہ کو زبان و ثقافت سے کاٹ کر کبھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ تو یہاں کی خوبصورتی ہے۔ کثیر التہذیب اور کثیر المذاہب ملک ہندوستان میں کثرت میں وحدت (Unity in Diversity) ہی اس کی اصل شناخت ہے۔ علاوہ ازیں قوم وملک کی قدیم وجدید تاریخ، جغرافیائی حدود وامتیاز، اختصاص اور معاشرت کو بھی کلچر کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا ہے اور ہم اسے قومی کلچر کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

ثقافتی معاشرے کی کچھ الگ اصطلاحیں بھی ہیں جو نئے مباحث کا حصہ بنتی رہی ہیں۔ جیسے یک ثقافتی معاشرہ(Mono Cultural Society) , کثیر الثقافتی معاشرہ(Multi Cultural Society), ثقافتی تکثیریت(Cultural Puluralism) وغیرہ۔ سماجیات میں یک ثقافتی معاشرے کی اصطلاح بہت دنوں سے رائج ہے۔ ثقافت میں یہ اصطلاح ایک مشترکہ عقیدہ، مشترکہ مقصد اور ایک گروپ یا سوسائٹی کی مشترکہ شناخت کی وضاحت کرتی ہے اور یہ ہر طرح سے رہبری، سربراہی اور قیادت کی قوت رکھتی ہے۔

اس میں مختلف رویوں اور طرز عمل کا تعلق ایک غالب گروپ یا سوسائٹی سے ہوتا ہے۔ اس میں ایک گروپ کی مشترکہ شناخت کی اپنی مضبوط بنیاد ہوتی ہے۔ لیکن اس میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ یک ثقافتی گروپ اپنی مخصوص یک ثقافتی فکر ونظر کی وجہ سے وسیع تناظر کی سوچ کو محدود کر سکتا ہے۔ جس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ گروپ ان افراد سے خود کو منسلک نہیں کرتے جو کسی مخصوص ثقافت کا حصہ نہیں بنتے۔ کیونکہ انہیں ثقافتوں کی کثرت سے اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ کہیں ان کا اپنا وجود ہی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اور ان کی

اپنی ثقافت ایک غالب ثقافت کی نذر ہو جائے۔

جبکہ کثیر الثقافتی معاشرے (Multi Cultural Society) میں مختلف النوع نسلوں، گروپوں اور قوموں کے افراد کی اپنی اپنی زبانیں، ادبیات،فنون،اپنی اپنی روایات،مقاصد،اپنے اپنے رویے وطرز عمل،اپنے اپنے عقائد وثقافتی طور طریقے اور اپنی اپنی مخصوص شناخت ہوتی ہے لیکن وہ ایک ساتھ ایک بڑی کمیونٹی میں سکون سے رہتے ہیں۔ کثیر الثقافتی برادریاں ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ، بھائی چارگی اور رواداری کو بحسن خوبی نبھاتی ہیں۔اس کی بہترین مثال کناڈا ہے۔جہاں مقامی افراد کے ساتھ چین اور ہندوستان کے علاوہ کئی ملکوں کی مختلف نسلیں آباد ہیں جو ایک ساتھ رہتی ہیں۔

اسی طرح معاشرے میں ثقافتی تکثیریت (Cultural Pluralism) ہم اسے کہتے ہیں جب اکثریتی معاشرے میں اقلیتی معاشرے کی اپنی منفرد شناخت قائم ہو جائے اور اسے اس کی اقدار اور طور طریقوں کو اکثریتی معاشرہ تسلیم کر لے۔یعنی بڑے معاشرے میں چھوٹے چھوٹے گروہوں کو ان کی ثقافتی شناخت کے ساتھ اگر غالب ثقافت ان کی اقدار اور قانون کے من وعن ضابطے کے ساتھ تسلیم کر لیتی ہے تو اسے ہم ثقافتی تکثیریت سے موسوم کرتے ہیں۔

ہمارے کئی اکابرین نے ثقافت کو کہیں تہذیب اور کہیں کلچر سے موسوم کیا ہے۔ان کی نظر میں یہ تینوں الفاظ مشترک ہیں۔جبکہ کچھ نے ان کے امتیازات بھی بتائے ہیں۔یہ ایک الگ بحث ہے۔فیض احمد فیض نے کلچر،تہذیب اور ثقافت کی تعریف کے ساتھ ان کے اجزائے ترکیبی بھی گنوائے ہیں۔انہوں نے لفظ ثقافت کو کلچر کے مترادف تسلیم نہیں کیا ہے۔ انہوں نے لفظ ثقافت کی جگہ تہذیب کے لفظ کو استعمال کرنے کی وکالت کی ہے۔وہ کہتے ہیں:

ہماری زبان میں کلچر کا ہم معنی لفظ موجود ہی نہیں۔یعنی وہ لفظ جس کو ہم بالکل اس کا مترادف کہہ سکتے ہیں۔ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔" ...."میں ثقافت کی بجائے پرانا لفظ تہذیب استعمال کروں گا۔جس سے ہم سب مانوس ہیں۔تہذیب سے میری مراد وہی مفہوم ہے جو لفظ کلچر کا ہے۔"

(پہلی تقریر' تہذیب کی تعریف ، مشمولہ' ہماری قومی ثقافت' مصنف فیض احمد فیض، مرتب مرزا ظفر الحسن، ادارہ یادگار غالب، کراچی، فروری 1976, ص:14-13)

فیض نے یوں تو ثقافت کی بجائے لفظ تہذیب استعمال کیا ہے لیکن تہذیب سے مراد لفظ کلچر کا معنی ہی لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلچر، تہذیب اور ثقافت ان تینوں کو وہ ایک ہی سمجھتے ہیں۔ فیض نے کلچر کو کچھ اس طرح سے سمجھایا ہے:

> ''ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے، اس کے آداب اور اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔''

(دوسری تقریر، پاکستانی تہذیب کے اجزا ؟ ترکیبی، مشمولہ ' ہماری قومی ثقافت' مصنف فیض احمد فیض، مرتب مرزا ظفر الحسن، ادارہ یادگار غالب، کراچی، فروری 1976, ص:21)

یہاں تہذیب، ثقافت اور کلچر تینوں کو ایک ہی زمرے میں رکھتے ہوئے اردو زبان اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا ایک مختصر ذکر بھی لازمی ہے کہ عالمی منظر نامے میں زبان اور ثقافت کے باہمی رشتہ کو اردو کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکے۔ ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنی کتاب "اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب' کے دیباچہ میں کچھ اہم نکات کی نشاندہی کی ہے۔ اس تعلق سے ان کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اردو زبان کے ساتھ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا ذکر لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح ہندو مسلمانوں کے ثقافتی میل ملاپ کا نتیجہ اردو کی صورت میں ظاہر ہوا، اسی طرح دونوں قوموں کی صدیوں کی زندگی کے طور طریق، فکر و نظر، دین و مذہب، مزاج وشوق، آداب واخلاق، رہن سہن، رسم ورواج اور علمی، ادبی وسماجی ذوق وشوق کے ایک

دوسرے سے ہم آہنگ ہونے سمجھنے سمجھانے اور شیر و شکر ہو جانے سے جن ملی جلی قدروں نے جنم لیا وہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی علمبردار کہلائیں۔"

(مشمولہ دیباچہ، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، اردو اکادمی دہلی، مارچ, 1987 ص:.19

پروفیسر آل احمد سرور نے تہذیب کے دائرہ معنی میں عوام وخواص کی رہن سہن، بودو باش، شادی بیاہ، رسم وروایت، میلے ٹھیلے، تہوار، گیت، جشن اور فنون لطیفہ کو شامل کیا ہے اور ہندوستانیت کو اجاگر کرنے کے لیے 'اردو اور ہندوستانی تہذیب' کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس میں برصغیر کی تہذیب وثقافت کو کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

"یہ برصغیر جسے جنوبی ایشیا بھی کہتے ہیں، دراصل تین تہذیبی دھاروں کا گہوارہ ہے۔ایک جنوبی ایشیا کی تہذیب ہے جسے سہولت کے لیے دراوڑی تہذیب کا حامل کہہ سکتے ہیں۔دوسری جنوبی

مشرقی ایشیا کی تہذیب ہے جس کا سلسلہ بنگال سے ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور تیسری وسط ایشیائی اور مغربی ایشیائی تہذیب ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب ان تینوں عناصر کا مرکب ہے"

(مشمولہ 'اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب' مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، اردو اکادمی، دہلی، مارچ ,1987 ص73)

ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنے مضمون بعنوان 'مشترک ہندوستانی تہذیب' میں کئی اہم پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ہندو اور مسلمانوں کی تفریق مٹا کر یک جہتی کی فضا قائم کرنے والے ایک کشمیر کے بادشاہ زین العابدین کے جس کارنامے کا ذکر کیا ہے وہ انتہائی قابل ذکر بھی اور لائق تحسین بھی۔وہ لکھتے ہیں:

"ہندو مسلمانوں کی تفریق کو مٹا کر باہمی یک جہتی پیدا کرنے میں
سب سے بڑا کارنامہ اس عہد میں کشمیر کے بادشاہ سلطان زین

العابدین کا ہے۔کشمیر سلطنت دہلی کے دائرہ اثر سے باہر رہا۔اس لیےاس کا ذکر ہندوستان کی عام تاریخ میں بہت کم آتا ہیاوراس کے اس عہد کے حالات سےہمیں بہت کم واقفیت ہےلیکن سلطان زین العابدین کا نام تاریخ اور تاریخ سے زیادہ روایات کے ذریعے سے جریدہ عالم پر ثبت ہوکر بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔وہ ہر لحاظ سے بہت بڑا بادشاہ تھالیکن اس کی سب سے بڑی صفت بےتعصبی اور رواداری تھی"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"اس نے ہندو مسلمان کی تفریق کو بالکل مٹا دیا۔فارسی کو ہندوؤں میں عام رواج دے کراس نے سارے کشمیر کی تہذیبی زبان ایک کردی۔اس کے حکم سے بہت سی سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجمے کیے گئے تاکہ مسلمان ہندوؤں کے مذہب اورتہذیب سے واقف ہوں۔"

(مشمولہ 'اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب'مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، اردو اکادمی، دہلی، مارچ 1987, ص:33-32)

اردو زبان وادب کےعظیم نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی شاہکار کتاب "اردو زبان اورلسانیات" کے دیباچہ میں اردو زبان کی تہذیبی وثقافتی روابط کو کچھ اس طرح سے اجاگر کیا ہے جس سے اردو زبان اور تہذیب وثقافت کے رشتے کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"سب جانتے ہیں کہ اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا، بنایا، اورسنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہےجس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوب زیست، ایک انداز نظر یا جینے کا ایک

سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط وارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔"

(اردو زبان اور لسانیات، گوپی چند نارنگ، رامپور رضا لائبریری، رامپور، اتر پردیش، انڈیا،2006,ص11)

زبان پر گفتگو کے دوران پیرالینگو ئج (paralanguage) کی بات بھی سامنے آتی ہے۔اس کی اپنی الگ اہمیت ہے۔تقریر کے دوران انداز گفتگو،لب و لہجے کا اتار چڑھاؤ، بولنے کا طریقہ، ہچکچاہٹ، اشارے اور چہرے کے تاثرات بھی بہت معنی رکھتے ہیں۔گفتگو میں علامتی اور استعاراتی الفاظ کا استعمال سے زبان کی قوت گویائی بڑھ جاتی ہے اور اس کے معنی الگ ہوتے ہیں۔جب بولتے ہیں تو ہم کبھی کبھی زور زور سے چیختے اور چلاتے ہیں اور کبھی کبھی آہستہ لہجے میں اپنی بات کہتے ہیں۔کبھی کبھی کسی خاص لفظ پر زور دیتے ہیں تو کبھی کبھی اپنا گلا بھی صاف کرتے ہیں۔کبھی ہم روتے بھی ہیں اور ہنستے بھی ہیں۔کبھی عاجزانہ لہجہ بھی اختیار کرتے ہیں۔کبھی سرگوشی بھی کرتے ہیں۔

انہی باتوں کو ہم پیرالینگو ئج کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔یعنی پیرالینگو ئج کو گفتگو کا غیر لغوی جز کہا جاتا ہے۔

ہم کبھی ہاتھ ہلاتے ہیں تو انگلی سے اشارے کرتے ہیں اور کبھی گڑگڑاتے بھی ہیں۔ گویا گفتگو میں کسی بھی طرح کا عمل ایک مخصوص معنی کو جنم دیتا ہے اور سامعین وناظرین اپنے اپنے طور پر اس کے معانی اخذ کرتے ہیں۔اس طریقہ اظہار سے مقرر کی ایک مخصوص انداز اور اس کی اپنی شناخت ابھر کر سامنے آتی ہے۔اس پیرالینگو ئج سے بھی ثقافت کا ایک گہرا رشتہ رہا ہے۔

ایک نوجوان امریکی تخلیق کار لی بیکن نے اپنی نئی کتاب "دی لاسٹ ہیومن" میں زبان اور ثقافت کے قدیم رشتے کو کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

"For many thousands of years, humans used pictures to communicate

their deepest emotions/fears/values. During the prehistoric era, they painted on the walls of caves. In later years, they framed their paintings and hung them in museums. They used pictures to tell stories, to entertain, to educate, to advertise. Eventually, humans discovered their most effective method of communicating through pictures".

(Lee Bacon, The Last Human,October, 2019,Google's,The emoji)

("ہزاروں سال سے انسان نے اپنے گہرے جذبات،خوف،اقدار کو بیان کرنے کے لیے تصویروں کا استعمال کیا۔قدیم تاریخی دور میں وہ غاروں کی دیواروں پر پینٹ کرتے تھے۔ بعد کے سالوں میں،انہوں نے اپنی پینٹنگز تیار کیں اور انہیں عجائب گھروں میں لٹکا دیا۔ وہ کہانیاں سنانے،تفریح،تعلیم دینے، اشتہار دینے کے لیے تصویروں کا استعمال کرتے تھے۔ بالآخر،انسانوں نے تصویروں کے ذریعے بات چیت کرنے کا اپنا سب سے مؤثر طریقہ دریافت کیا" .) ہم جو طریقہ اظہار کو سنتے یا دیکھتے ہیں۔اس کے دوسروں پر اثرات بھی پڑتے ہیں۔

باڈی لینگوتج کا بھی بہت اثر دکھائی دیتا ہے۔کچھ باڈی لینگوتج کو ایک ملک میں اگر مثبت طور پر لیا جاتا ہے تو وہی باڈی لینگوئج دوسرے ملک کے لیے منفی طور پر استعمال کیا جاتا ہے، جس سے بعض دفعہ تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں۔اس لیے گفتگو کے دوران باڈی لینگوئج اور اس کے اشاروں کو بہت سنبھل کر استعمال کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب کسی زبان میں تبدیلی آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ثقافت کی بدلتی اقدار کی پوری طرح نمائندگی کر رہی ہے۔گویا زبان کی تبدیلی

ثقافت کی بدلتی اقدار کی علامت ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ زبان اور ثقافت کا باہمی رشتہ قریب ترین ہے۔ جب تک ہماری دونوں سے واقفیت نہیں ہوگی اس وقت تک ان کے آپسی رشتے کو نہیں سمجھ سکتے۔

زبان معاشرے میں انسانی زندگی کی سب سے اہم جز ہے تو ثقافت زبان سیکھنے کی کلید ہے۔ یعنی زبان انسان کے تمام خصائص سے وابستہ ہے اور معاشرے کی ثقافت کی بہتر سمجھ سے زبان میں پختگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور زبان کی وجہ سے ہی ثقافتی اقدار کا فروغ اور ارتقاء ہوتا ہے۔ ایک امریکی ماہر لسانیات کینتھ لاک ہیل (15 اگست، 1934 - اکتوبر 8، 2001)، جسے کین ہیل بھی کہا جاتا ہے کا کہنا ہے کہ کوئی بھی زبان اس وقت کمزور پڑ جاتی ہے جب وہ ثقافت سے کٹنے لگتی ہے یا یوں کہیے کہ اگر ثقافت کا ایک معمولی سا حصہ بھی اس زبان کے اظہار سے باہر رہ جائے تو پھر وہ زبان شکست کی شکار ہونے لگتی ہے۔ یعنی ثقافت سے وابستگی کی وجہ سے ہی زبانیں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ وہ باریک نکتہ ہے جس کی مدد سے ہم زبان اور ثقافت کے آپسی رشتے کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہماری تمام بنیادی روایات، نظریات اور رجحانات ثقافت سے ہی وابستہ ہیں۔ زبان ہمارے سماجی روابط کو مضبوطی فراہم کرتی ہے اور ثقافت ایک دوسرے سے جڑے رہنے کا بہتر طریقہ سکھاتی ہے۔ یہاں ایک سوال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ جب زبان اور ثقافت کا رشتہ اتنا گہرا ہے تو پھر پہلے زبان وجود میں آئی کہ ثقافت۔ چونکہ زبان سماجی معاملات کو آواز دینے کے ساتھ اسے فروغ دیتی ہے اوت اس کی وضاحت بھی کرتی ہیاس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ پہلے زبان ہی وجود میں آئی۔ اس طرح زبان ہی ثقافت کا ماخذ بھی ہے اور جوہر بھی۔ ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں کم وبیش سات ہزار زبانیں ہیں۔ لیکن ان میں سے نصف سے زائد زبانیں معدوم ہو چکی ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ زبانیں اپنی ثقافت سے الگ ہوئیں تو ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ اور جو زبانیں تحریری طور پر زندہ ہیں وہ اپنی ثقافتی اقدار کے اظہار کے سبب زندہ ہیں۔ ثقافت کی وجہ سے جہاں زبانیں پروان چڑھی ہیں وہیں زبان کی وجہ سے ثقافت بھی فروغ پائی ہے۔ زبانیں وقت کے ساتھ ساتھ بھی بدلتی ہیں اور ثقافتی اقدار سے گہری وابستگی سے بھی بدلتی ہیں۔ اس لیے زبان اور ثقافتی تنوع میں

خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اگر ثقافت نہیں تو زبان نہیں۔ اسی طرح اگر زبان نہیں تو ثقافت نہیں۔

یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ ثقافت کے بغیر کوئی زبان فروغ نہیں پا سکتی۔ اور اسی طرح زبان کے بغیر کوئی بھی ثقافت ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے یہاں انگریزی زبان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ انگریزی زبان جس قدر مضبوط ہوئی ہے اسی قدر مغربی ثقافت میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آج جو انگریزی زبان ہم بولتے ہیں وہ قدیم انگریزی زبان سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہم قدیم مغربی ثقافت کے مقابلے جدید مغربی ثقافت میں بہت سے تغیرات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ حسب ضرورت ثقافت اور زبان میں تبدیلی وقت کا تقاضا بھی ہے۔ اگر کسی گاؤں یا شہر کے ایک چھوٹے بچے اور ایک بوڑھے شخص سے ایک ہی زبان اور ایک ہی ثقافت کی امید رکھتے ہیں تو یہ بیوقوفی کی بات ہوگی۔ دونوں ایک ہی زبان استعمال کریں اور ایک ہی ثقافت کو پسند کریں یا شئیر کریں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب ایک شخص ایک مخصوص زبان اور ثقافت سے آشنا ہے، اس سے گہرا رشتہ ہے اور اسے گہرا تجربہ حاصل ہے تو اس کی شخصیت پر اس کے گہرے اثرات ضرور مرتب ہوں گے۔ ثقافت ہماری اخلاقیات کو مضبوط کرتی ہے اور دوسروں سے بات کرنے اور بہتر سلوک رکھنے کا سلیقہ سکھاتی ہے نیز معاشرے سے بہتر رابطہ قائم رکھنے کے ہنر سے واقف کراتی ہے۔ وہیں دوسری جانب زبان ہم کو ثقافت سے گفتگو کا ہنر سکھاتی ہے۔ دراصل زبان عقائد اور تہذیبی و ثقافتی فکر و نظر کو وسعت دینے کے لیے وسیلہ کے طور استعمال ہوتی ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ جب زبان اور ثقافت کے بدلنے سے انسان کی شخصیت میں بھی ترقی دکھائی دیتی ہے۔ یعنی انسان کی شخصیت بھی ترقی پذیر ہوتی ہے۔ جب ہم مختلف ثقافت سے تعلق رکھنے والے افراد سے رابطہ کرتے ہیں۔ ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ ان کی ثقافت کے بارے میں جانتے ہیں تو اس کا اثر بھی قبول کرتے ہیں پھر یہی اثر دوسرے کرداروں میں منتقل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں شخصیت کا ارتقا پزیر ہونا لازمی ہے۔ ثقافت متعلقہ معاشرے کو متحد کرتی ہے اور زبان اسے طاقت بخشتی ہے۔ وقت کے

ساتھ ساتھ پرانی نسل کی زبان و ثقافت اور نئی نسل کی زبان و ثقافت میں نمایاں تبدیلی صاف طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی مناسب لگتا ہے کہ اگر ایک شخص کوئی نئی زبان سیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے متعلقہ زبان کی ثقافت سے آشنا ہو جائے۔ کسی بھی غیر ملکی زبان کو سیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زبان کی ثقافت کو وہ پہلے سمجھے پھر زبان سیکھے۔ اس لیے کہ جب وہ شخص اس زبان کو سیکھ لے گا اور اسے اس کی ثقافت کے ساتھ پیش کرے گا تو اس سے لوگ گرویدہ ہوں گے اور اس کی وہ سیکھی ہوئی زبان مزید طاقتور بن کو سامنے آئے گی۔ درحقیقت ثقافتی تناظر کے پیش نظر سیکھی گئی زبان زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ ثقافتی پس منظر میں انسان تیزی سے اس زبان کو سیکھتا بھی ہے۔

ایک نوجوان معروف تخلیق کار ابھجیت نسکر کی زبان اور ثقافت کے تعلق سے یہ رائے ایک نئی بحث کا در کھولتی ہے اور جو خاص اہمیت کی حامل بھی ہے:

"My favorite language in the world is Turkish,Because its culture electrifies my scars. My favorite language in the East is Telugu, Because its music emboldens my nerves. My favorite language in the West is Spanish, Because it teaches me the worth of freedom. Favorite ancient tongues are Arabic 'n Sanskrit, For one embodies peace, another assimilation.

(Abhijit Naskar, Insan Himalayanoglu: It's Time to Defect, Google's' wordpress.com".)

("دنیا میں میری پسندیدہ زبان ترکی ہے،
کیونکہ اس کا کلچر میرے زخموں کو جلا دیتا ہے۔
مشرق میں میری پسندیدہ زبان تیلگو ہے،
کیونکہ اس کی موسیقی میرے اعصاب کو حوصلہ دیتی ہے۔
مغرب میں میری پسندیدہ زبان ہسپانوی ہے،
کیونکہ یہ مجھے آزادی کی قدر سکھاتا ہے۔
پسندیدہ قدیم زبانیں عربی اور سنسکرت ہیں،
ایک کے لیے امن کا مجسمہ ہے، دوسرا جذبہ۔")

مختصر یہ کہ زبان کا ایک گہرا رشتہ اس کے سماجی وتہذیبی وثقافتی عوامل سے ہے اسی طرح ثقافت کا گہرا تعلق زبان کے بنیادی عناصر سے بھی رہا ہے اور ارتقاپذیر زبان کی خصوصیات سے بھی۔ اس مطالعے کے لب لباب کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان اور ثقافت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ یعنی جس طرح ناخن سے گوشت کو اور گوشت سے ناخن کو جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح زبان کو ثقافت اور ثقافت کو زبان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

○○○